ڈاکٹر سہیل بخاری

تقابلی لسانیات

اٹھارھویں صدی عیسوی کی دھوپ سنو لا رہی تھی اور سراج الدولہ کے بنگال پر انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سائے گہرے ہو رہے تھے کہ سر ولیم جونس نامی ایک شخص انگلستان سے جج بن کر بنگال پہنچا جس نے مقامی فضا سے مانوس ہو کر سنسکرت کا مطالعہ کیا اور اس کا نتیجہ اپنے ایک مقالے میں پیش کیا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے مجلے میں ۱۷۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس نے لکھا تھا:

''سنسکرت زبان چاہے جتنی قدیم ہو اس کی ساخت ضرور حیرت انگیز ہے۔ یہ یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ جامع اور دونوں سے زیادہ شستہ و رفتہ ہے اور پھر دونوں سے فعلی مادوں اور گرامری روپوں میں اتنی گہری مشابہت رکھتی ہے جو اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ مشابہت واقعی اتنی گہری ہے کہ کوئی زبان شناس ان تینوں زبانوں کو جانچنے کے بعد یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کسی ایسے مشترک سرچشمے سے نکلی ہیں جو اب باقی نہیں رہا۔ کچھ اسی قسم کی بات سے جو اگرچہ اتنی پر زور نہیں ہے یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ گاتھک اور کلٹی کا بھی وہی ماخذ تھا جس سے سنسکرت نکلی ہے اور قدیم فارسی بھی اسی خانوادے میں شمار کی جا سکتی ہے'' ۔[1]

ولیم جونس نے لسانی مشابہت کی نشان دہی کے علاوہ اور کوئی تقابلی مطالعہ پیش نہیں کیا اور لسانی مشابہت کی طرف اشارہ کرنے والا بھی وہ کوئی پہلا شخص نہیں تھا۔ اس سے پہلے ۱۷۶۷ء میں کاردو نامی ایک فرانسیسی عیسائی مبلغ نے بھی فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ کو ایک یادداشت بھیجی تھی جس میں اس نے سنسکرت اور لاطینی کے بہت سے لفظوں میں مشابہت دکھائی تھی اور سنسکرت کے بیانیہ حال اور شرطی ''اسمی'' (میں ہوں) کا لاطینی گرامر کے ایسے ہی روپوں سے موازنہ بھی کیا تھا لیکن اس کی تحریر چالیس سال کے بعد چھپی تھی اس لیے ۱۷۸۶ء سے پہلے یورپ والوں کو اس حقیقت حال کا علم نہیں ہو سکا۔ ادھر خود ہندوستان میں بھی ولیم جونس سے تقریباً سو سال پہلے اردو کے مشہور شاعر سراج الدین علی خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۹۱ء) نے اپنی کتاب ''نوادر

۱- لینگوئج، ص ۳۳

الالفاظ" میں جو مولوی عبدالواسع ہانسوی کے لغت "غرائب اللغات" پر نظرثانی کرکے مرتب کی تھی - سنسکرت اور فارسی کے کتنے ہی مشابہ الفاظ کی نشان دہی کی تھی اور اس حقیقت کو "توافق لسانین" کا نام دیا تھا لیکن اس سے بھی لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی -

ولیم جونس کا مقالہ اس لحاظ سے لسانیات کے خاموش تالاب میں پہلا کنکر ثابت ہوا جس کی پیدا کی ہوئی لہروں نے پوری انیسویں صدی عیسوی میں ہلچل مچائے رکھی - اس سے زبان شناسوں میں زبانوں کے موازنے اور مقابلے کی تحریک پیدا ہوئی اور لسانیات میں ایک نئے شعبے "تقابلی لسانیات" کی بنیاد پڑی جسے آگے چل کر "تاریخی لسانیات" کا نام بھی دے دیا گیا کیونکہ لوگ چل پھر کر اپنے کانوں سے دیس دیس کی زبان سننے کے بجائے مزے سے گھروں میں بیٹھے بیٹھے قدیم تحریریں پڑھ پڑھ کر زبانوں کا موازنہ اور مقابلہ کرنے لگے اور اس کے لیے انھوں نے غالباً ویدک ، سنسکرت ، یونانی اور لاطینی وغیرہ ہی کی تحریریں پیش نظر رکھیں - پھر انھوں نے ولیم جونس کے بیان سے وقت کی عینک مستعار لے کر ہر زبان کو قدیم و جدید دو حصوں میں بانٹنا شروع کر دیا حالانکہ کسی تحریر کا قدیم یا پرانا ہونا اس کی زبان کے بھی قدیم ہونے کی دلیل نہیں بنتا -

زبان قدیم ہو بھی کیسے سکتی ہے جب کہ ہر زبان نئی نسل پرانی نسل کے منہ سے سن کر سیکھتی ہے - لوگ جو زبان آج بول رہے ہیں وہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھی اور ان کے بزرگوں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھی - اسی طرح زبان میں ایک تسلسل ملتا ہے جس کا آخری سرا تو ہمارے منہ میں ہے لیکن پہلا سرا نہ جانے ماضی بعید کی تاریکی میں کہاں سے شروع ہوتا ہے - انسانوں کی ایک نسل مرتی اور دوسری پیدا ہوتی رہتی ہے اور نئی نسل پرانی نسل کی زبان سنبھالتی رہتی ہے یوں انسانی نسلیں تو نئی پرانی. کہلا سکتی ہیں اور کہلاتی بھی ہیں پر کسی زبان میں کوئی نئی پرانی نسل نہیں ہوتی کیونکہ نہ کوئی زبان انسانوں کی پرانی نسل کے ساتھ مرتی ہے اور نہ نئی نسل کے ساتھ شروع ہوتی ہے یعنی نہ انسانوں کی طرح کوئی زبان مرتی ہے اور نہ پیدا ہی ہوتی ہے - ہماری تاریخ کا علم کوئی چھ سات ہزار سال کو محیط ہوگا لیکن اس عرصے میں ایک بھی زبان نہیں بنی اور نہ کوئی زبان مری ہی ہے - زبانیں جو بننا تھیں وہ بن چکیں اور اسی ماضی بعید میں بن چکیں جو آج ہمارے تخیل کی دسترس سے بھی باہر ہے - وہی زبانیں جو آج ہمارے گرد و پیش بولی جا رہی ہیں - زمانۂ قدیم سے آج تک نسل در نسل انسانوں کی زبانوں پر ہوتی ہوئی ایک خط مستقیم میں

تسلسل کے ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ اب ان میں قدیم و جدید کی تفریق کس طرح ہو سکتی ہے اور کس نقطے سے اور کس مقام و وقت سے ہو سکتی ہے؟ ماہرین لسانیات بھی صرف اس زبان کو قدیم کہتے ہیں جو اب بولی نہیں جاتی اور جو صرف تحریروں میں باقی ہے یعنی وہ ان کے نزدیک مر چکی ہے لیکن انھوں نے یہ کیسے جان لیا اور سمجھ لیا کہ جو زبان ہمارے سامنے تحریری شکل میں موجود

ہے وہ مر بھی چکی ہے یعنی اب وہ دنیا میں، کہیں بولی نہیں جاتی۔ وہ اس سوال کا جواب نہیں دے پاتے۔ میرے نزدیک وہ اس زبان کو اس لیے مردہ کہتے ہیں کہ وہ اس کی تحریر صحیح صحیح پڑھ نہیں پاتے کیونکہ وہ اس تحریر یا لپی کے حروف اور اس زبان کی آوازوں کے رشتے سے نابلد ہیں اور جب وہ اپنے محدود علم کے زور پر اسے پڑھ کر جناتی آوازیں نکالنے لگتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ زبان مر چکی ہے۔

زبانوں کے اس تاریخی مطالعے میں لپی کا نہ صرف قدم درمیان میں آتا ہے بلکہ مطالعے کا دارو مدار ہی لپی پر ہوتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ لپی زبان کو محفوظ کرنے کے لیے بنی تھی لیکن آج دنیا کی کوئی لپی کسی زبان کو سو فیصدی صحت کے ساتھ محفوظ نہیں کر پاتی۔ اس زبان کو بھی گرفت میں نہیں لا پاتی جس کے علاقے میں اور جس کی خاطر وہ ایجاد کی گئی تھی۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بالکل صحیح صحیح نہیں پڑھا جا سکتا اور جو پڑھا جاتا ہے وہ اس سے کچھ نہ کچھ ضرور مختلف ہوتا ہے جو قلم بند ہوا ہے۔ ہم کسی تحریر کو صرف اسی وقت زبان کے مطابق صحیح پڑھ سکتے ہیں جب اس زبان کی ملفوظی روایت بھی ہم تک پہنچ چکی ہو۔ ہمارے صحیح صحیح پڑھنے کے لیے آواز اور حرف کے باہمی تعلق کے ساتھ لپی اور زبان دونوں کی روایتوں کا پورا پورا علم بھی ناگزیر ہے۔ ہماری صحیح خوانی یا غلط خوانی میں کمی بیشی اسی علم کی کمی بیشی پر منحصر ہوتی ہے۔

یہ بھی انسانی مجبوری کا ایک پہلو ہے کہ ہم کان (سماعت) اور آنکھ (بصارت) کا درمیانی فاصلہ یعنی آواز اور حرف کا فرق ایک مفروضے سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آواز کو تصویر اور تصویر کو آواز میں ہو بہو منتقل کر لیں لیکن پرخلوص خواہش اور شدید کوشش کے باوجود لپی کی حد تک ہمیں اس میں سو فی صدی کامیابی حاصل نہیں ہو پائی ہے۔ ہم جیسا سنتے ہیں ویسا دیکھ نہیں سکتے اور جیسا دیکھتے ہیں ویسا سن نہیں سکتے یعنی سماعت کو بصارت میں اور بصارت کو سماعت میں من و عن نہیں ڈھال سکتے۔

آواز اور حرف کا تعلق فرضی ہوتا ہے جو وقت اور جگہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ تعلق کی اس روایت سے ہم جس قدر دور ہوں گے کسی تحریر کے پڑھنے میں اتنی ہی وحشت ناک آوازیں نکالیں گے اور پھر کہہ اٹھیں گے کہ زبان بدل گئی ہے -

ہماری غلط خوانی اور لپی کی معذوری کے چند اسباب ہوتے ہیں -

دنیا کی مختلف زبانوں میں بعض آوازیں مشترک اور بعض مختلف ہوتی ہیں - جس علاقے میں کوئی لپی ایجاد ہوئی ہے اس علاقے میں بولی جانے والی زبان کی جملہ آوازوں کو اس میں محفوظ کرنے کے لیے حروف اور ان کی ملاوٹ وغیرہ کے قاعدے بنائے گئے ہیں لیکن جب اس لپی میں کسی دوسری زبان کو قلم بند کرنا ہوتا ہے تو اس کی مخصوص آوازوں کے لیے لپی کے ملتے جلتے حروف سے کام چلایا جاتا ہے یا ان میں کچھ ترمیم کر لی جاتی ہے جیسے فارسی والوں نے عربی لپی میں پ ، چ ، ژ ، گ کے حروف کئی کئی نقطوں اور ایک کشش کے اضافے سے بنا لیے - اردو والوں نے ان کے علاوہ چھوٹی سی ایک طوئے کا اضافہ کرکے اپنے مخی حروف (ٹ ڈ ڑ) اور دو چشمی ہے (ھ) کے اضافے سے بھاری آوازوں کے لیے حروف (بھ پھ وغیرہ) تیار کر لیے۔ سندھی والوں نے صرف مخی نون (ڻ) کے لیے ایک چھوٹی طوئے لگائی باقی مخی اور بھاری آوازوں کے لیے مزید نقطے لگا لگا کر نئے حروف بنائے - پشتو والوں نے اپنی زبان قلم بند کرنے کے لیے انہیں حروف تہجی پر کچھ مختلف نشانات لگا کر کام چلایا - ان اصطلاحات کے باوجود اردو میں اس لپی سے ابھی پورے سر (اصوات علت) ادا نہیں ہو پاتے نہ پوری انفی آوازیں ہی صحت کے ساتھ قلم بند ہو پاتی ہیں - و اور ی کبھی سروں (اصوات علت) اور کبھی اسروں (اصوات صحیحہ) کے لیے استعمال ہوتے ہیں - اس سے تلفظ میں ہر وقت گڑ بڑ کا امکان رہتا ہے اور پھر ان کا فالتو استعمال بھی بہت ہوتا ہے جب یہ دم سادھے پڑے رہتے ہیں اور مطلق چوں نہیں کرتے چنانچہ پیارا اور جواری وغیرہ الفاظ میں ان کی حالت قابل رحم ہوتی ہے -

لپی کی مجبوریاں ویدک کی دیوناگری لپی میں بھی سامنے آتی ہیں - اس میں آریائی زبان کی خصوصی آوازوں (خ ز ژ غ ف) کے لیے حروف نہیں ہیں اس لیے دوسرے موجود حروف پر نقطے لگا کر کام چلایا جاتا ہے - چار مختصر سروں کے لیے علامات یا حروف نہیں ہیں - اردو وغیرہ کے بعض سروں کے لیے بھی حروف یا علامات نہیں ہیں - رومن لپی کا حال سب سے ابتر ہے - اس میں صرف پانچ ہی سروں سے کام چلانا پڑتا ہے - غنہ کے لیے سرے سے کوئی حرف ہی نہیں ہے - فارسی کی خصوصی اور دندانی آوازوں اور اردو کی مخی اور بھاری آوازوں کی

نمائندگی میں بھی سخت دقت پڑتی ہے - چھوٹے بڑے سر کی بھی کوئی اٹکل نہیں ہے - ایک ایک حرف کئی کئی آوازوں کی ترجمانی کرتا ہے اور کئی کئی حروف صرف ایک ہی آواز کے لیے مقرر ہیں - پھر لفظ کی ابتدا اور اخیر میں کئی کئی اسروں (حروف صحیحہ) کے جٹ بلاوجہ بڑھا دیے جاتے ہیں - ان کی کوئی آواز نہیں نکلتی اور بعض بعض حروف لفظوں کے درمیان میں بھی خاموش لیٹے رہتے ہیں - ان تمام خامیوں کے باعث اس کا تلفظ غلاظ ترین ہوتا ہے -

لپیوں کے صحیح صحیح نہ پڑھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں جو زبان محفوظ کی گئی ہے اس کی آواز اور اس لپی کے حروف کا باہمی تعلق حتمی اور یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا - وقت اور جگہ کے بدل سے یہ تعلق لامعلوم رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والا کچھ عجیب سی آوازیں لگانے لگتا ہے - یہ بات دو ایک مثالوں سے واضح ہو جائے گی -

رومن لپی کا حرف سی (C) کہیں س اور کہیں کاف کی ترجمانی کرتا ہے - ہمارے برصغیر میں علی العموم ایسا ہی سمجھا جاتا ہے جیسے ریس (race - دوڑ) اور کار (car - موٹر گاڑی) لیکن اس بات سے بےخبری پائی جاتی ہے کہ اس حرف جیم کی اواز بھی نکلتی ہے جیسے رومن A B C D=عربی ا ب ج د (ابجد) ، رومن Celal=عربی جلال ، رومن Cavet=جاوید ، رومن Camel=عربی جمل (اونٹ) - یہی نہیں خود انگریزی میں بھی ایک قدیم لپی کو ہیرو غلیفی (hieroglyph) کہتے ہیں حالانکہ یہ اصلیت میں ایرو گراف (arrowgraph) ہے جس کا مطلب تیر نگاری ہے - رومن کا حرف جی (g) کبھی جیم ، کہیں کاف اور کہیں ز کی نمائندگی کرتا ہے مثلاً Gamel (جمال) ، gem (جیم - جوہر ، قیمتی پتھر) ، graph (گراف - تحریر ، نقشہ ، ترمیمہ) ، goul (گول - مقصد) اور Ego (سعدی ازو - واحد متکلم میں) -

اسی طرح دیونا گری لپی کی ہ کو لوگ علی العموم ہائے ہوز سمجھتے ہیں - اسی ظن غالب کے زیر اثر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب اردو زبان کا ارتقاء میں یہ اعلان کر دیا کہ سنسکرت لفظ ''اہم'' (میں - واحد متکلم) کا ابتدائی الف ساقط کرکے اردو کا لفظ ''ہم'' (ہم - جمع متکلم) تراشا گیا ہے - اس اشتقاقی کوشش میں دو من مانی تبدیلیاں کی گئیں - ایک تو سنسکرت لفظ کا ابتدائی الف بلا جواز ساقط کرکے اس کا مکتوبی روپ بگاڑا گیا - دوسرے اس کے معنی میں بھی تحریف کی گئی اور ضمیر واحد متکلم کی جگہ ضمیر جمع متکلم کا مفہوم ٹھونس دیا گیا اور اس پوری ذہنی ورزش کا سبب اس حقیقت سے بےخبری تھی کہ سنسکرت کی دیونا گری لپی کی ہ (ہ) اوستائی زے (ز) اور فارسی قدیم کی دال (د) کی ترجمان ہے یعنی سنسکرت کا لفظ ''اہم'' اوستائی لفظ ''ازم'' اور فارسی قدیم کے

لفظ اوم (بمعنی میں : واحد متکلم) کا مکتوبی روپ ہے - اس کا اردو کے لفظ ''ہم'' سے کسی قسم کا کوئی تعلق اوو واسطہ نہیں ہے -

بہرحال کارڈو اور آرزو کے مقابلے میں سر ولیم جونس کا مقالہ اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے مغرب کے زبان شناسوں میں زبانوں کا موازنہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی - انھوں نے تقابلی لسانیات کے مطالعے میں زبانوں کی صوتی ، حرفی اور نحوی مشابہتوں کے ساتھ ساتھ ان کے اختلافات بھی دیکھے - انھوں نے مشابہتوں سے تو یہ نتیجہ نکالا کہ مشابہ زبانیں باہم رشتے دار ہیں اور زمانہ قدیم کے کسی ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہیں اور اختلافات کی یہ توجیہ کی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں جس سے یہ ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں -

علمانے مغرب زبانوں کے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں ملتی جلتی زبانوں کو ایک لسانی گروہ میں رکھتے گئے اور یوں انھوں نے قریب قریب پوری دنیا کی زبانوں کو کئی مختلف خاندانوں میں تقسیم کر لیا جن میں سب سے بڑا خاندان ہند جرمانی یا ہند یورپی تیار کیا - اس کی ایک شاخ ہند آریائی ہے اور ہند آریائی شاخ میں شمالی ہندوستان کی تمام زبانیں شامل کر دی گئی ہیں جن میں ہماری زبان اردو کا بھی نام آتا ہے - اس خاندان کو اتنا بھاری بھر کم بنانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ ان کی مادری زبانوں کا خاندان تھا اور مادری زبان سے اور لوگوں کی طرح انھیں بھی بہت زیادہ پیار تھا ورنہ میرے نزدیک اس بڑے خاندان کا نام صرف آریائی ہونا چاہیے جسے تین شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - یورو آریائی (یونانی ، لاطینی ، جرمن وغیرہ) ، ایرانی آریائی (اوستائی ، پہلوی ، دری ، فارسی وغیرہ) اور ہند آریائی (ویدک اور سنسکرت) - اور اردو اور اس کی تمام پڑوسی بولیاں جو شمالی ہندوستان میں بولی جا رہی ہیں ایک جداگانہ خاندان ہندوی یا ہندوستانی میں شامل ہیں - ان کا ہند آریائی خاندان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے جیسا کہ آیندہ صفحات میں ثابت کیا جائے گا -

مغربی محققین کو اختلافات زبانوں کی صوتی تبدیلیوں میں تو نظر آ ہی چکے تھے اب انھوں نے دوسرے اختلافات بھی تلاش کرنا شروع کر دئے اور یہ اصول بنا دیا کہ زبان مرور ایام کے ساتھ ساتھ بدلتے بدلتے ایک دن بالکل ہی بدل جاتی ہے - آخر پہلی زبان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے اور دوسری زبان اس کے بطن سے جنم لے لیتی ہے - دو زبانوں کے اختلافات سے قطع نظر انھیں جب ایک زبان میں بھی بعض روپ دوسرے روپوں سے مختلف نظر آئے تو انھوں نے ایک کو قدیم اور دوسرے کو جدید قرار دے دیا حالانکہ ان کے پاس اس قسم کا فیصلہ کرنے کے لیے کوئی لسانی اصول موجود نہیں تھا نہ محض مفروضے کے سوا کوئی ٹھوس

مادی ثبوت ہی تھا - علمائے مغرب میں اب یہ رسم پڑ گئی ہے کہ وہاں کا ہر محقق اپنی گفتگو کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے کہ زبان مرور ایام کے ساتھ بدل جاتی ہے -

دراصل زبان کی تبدیلی کا یہ نظریہ (غالباً مفروضہ) ایک غلط فہمی پر قائم ہوا ہے جو زبان کی بوقلمونی یا رنگا رنگی سے پیدا ہوئی ہے - یہ بوقلمونی ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے- ہر زبان ایک محدود علاقے میں بولی جاتی ہے جس کے باہر دوسری زبان کا راج ہوتا ہے لیکن پڑوسی زبانوں میں کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور ہوتی ہے کم سے کم درمیانی سرحد کے آس پاس تو مشابہت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے - اب اگر ہم ان دو مختلف زبانوں کے مشابہ روپوں کو قدیم اور جدید قرار دے دیں تو یہ نافہمی ہی ہوگی - پھر ایک زبان کے بھی کئی کئی رنگ ہوتے ہیں - اس کا معیاری محاورہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو دوسرے ذیلی محاوروں کے مقابلے میں ایک قابل شناخت امتیازی شان رکھتا ہے -[1] پھر عورتوں کی زبان بھی مردوں سے کچھ بہت مختلف ہوتی ہے - بعض محاورے ، روزمرے ، الفاظ اور جملے صرف عورتوں سے مخصوص ہوتے ہیں جنھیں مرد استعمال نہیں کرتے اور اگر استعمال کر جائیں تو گدا بن جائیں اور دوسروں کو اپنے اوپر ہنسوائیں - پھر زبان کے سماج میں مختلف طبقے ہوتے ہیں مثلاً کسان ، زمیندار ، دھوبی ، نائی ، قسائی ، کاریگر ، مزدور ، بھکاری ، جاہل ، تعلیم یافتہ ، نجومی ، فنکار، صنعت کار، تماشاگر، مچھیرے وغیرہ جو مخصوص محاورے ، الفاظ اور اسالیب بیان رکھتے ہیں - خود ایک ہی شخص مختلف اوقات ، مختلف حالات اور مختلف مزاجی کیفیات میں مختلف زبان بولتا ہے -

غرض یہ ہے کہ زبان کے اتنے رنگوں کو جو ہمیں ایک ہی لسانی سماج میں پہلو بہ پہلو ملتے ہیں مغربی محققین مکانی خط کی جگہ زمانی خط پر رکھ کر قدیم اور جدید کا نام دیتے ہیں اور زبان کی بوقلمونی کو زبان کی تبدیلی سے تعبیر کر اٹھتے ہیں - زبان کی ہر اکائی کے کئی کئی روپ جو بیک وقت ہمارے اردگرد بولے جا رہے ہیں زبان کی ثروت کے آئینہ دار ہیں - زبان کوئی سکڑی گلی نہیں ہے جس میں ہو کر صرف ایک ہی قطار کے گزرنے کی گنجائش ہو بلکہ یہ ایک مناسب حد تک چوڑی شاہراہ ہے جس پر ہو کر ایک سے زیادہ قطاریں پہلو بہ پہلو گزر سکتی ہیں اور گزرتی رہتی ہیں - ان پہلو بہ پہلو بولے جانے والے کئی کئی متبادل لغات یا گرامری روپوں کو آگے پیچھے کرکے ان میں سے ایک کو قدیم اور دوسرے کو جدید سمجھنے سمجھانے کا نہ کسی کو اختیار ہے اور نہ کسی کے پاس اس کی کوئی دلیل و جواز ہی ہے -

---

۱- اردو کی کہانی - پانچواں رنگ -

تقابلی لسانیات کے ماہرین میں تین ابتدائی محققین کا نام زیادہ مشہور ہے۔ فرانس کا فرانزبوپ (ولادت ۱۷۹۱ء)، ڈنمارک کاریزمس ریسک (ولادت ۱۷۸۷ء) اور جرمنی کا جیکب گرم (ولادت ۱۷۸۵ء) - ان میں بوپ تقابلی لسانیات کا بانی سمجھا جاتا ہے - اس کی کتاب ''کانجوگیشن سسٹم'' یعنی گردان (سنسکرت، یونانی، لاطینی، فارسی اور، کے گردانی نظاموں کا تقابل) ۱۸۱۶ء میں شائع ہوئی - ریسک کی کتاب ۱۸۱۸ء میں منصہ شہود پر آئی اور جیکب گرم کی کتاب ''جرمانی گرامر'' ۱۸۱۹ء میں چھپی - اس کے بعد اسے ریسک کی کتاب مطالعے کے لیے مل گئی تو اس نے اپنی جرمانی گرامر پر نظر ثانی کی اور اس میں صوتیاتی مباحث تفصیل کے ساتھ شامل کرکے ۱۸۲۲ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر دیا۔ اس نے جن زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا تھا ان میں صوتی تبادل کو ایک کلیے اور اصول کے تحت جمع کر دیا جسے گرم کا قانون کہتے ہیں - یہی دراصل ریسک کا قانون ہے جو اس کی کتاب میں موجود ہے۔ صوتی تبادل سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی لفظ دو مختلف آوازوں سے بولا جاتا ہے۔ اس طرح اس کے دو ملفوظی روپ ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک روپ میں ایک اور دوسرے روپ میں دوسری آواز بولی جاتی ہے لیکن اس لفظ کے معنی بالکل نہیں بدلتے بلکہ وہی رہتے ہیں - ریسک کا قانون یہ ہے -

لاطینی ، جرمن	
	پ=ف
	ت=ث
	ک=ہ

گرم نے اس صوتی تبدیلی کی مثالوں میں اضافہ کرکے صوتی تبادل کو اس طرح منظم کر دیا کہ اس میں ہائی جرمن زبان کا ثانوی تبادل بھی شامل ہو گیا اور اب اس کی شکل یہ ہو گئی -

زبان	شفوی	دندانی	حلقی
یونانی	پ ب ف	ت د ث	ک گ خ
گاتک	ف پ ب	ث ت د	ہ گ ک
ہای جرمن	(و) ب ف پ	د ز ت	گ خ ک

اس کا خلاصہ یہ ہوا ۔

یونانی	ک ت پ = ہائی جرمن	گ د ب
ہائی جرمن	ک ت پ = گاتھک	گ د ب
گاتھک	ک ت پ = یونانی	گ د ب

اور یہ مصیت اور غیر مصیت آوازوں کا تبادل ٹھیرا ۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جیکب گرم کے اس قانون میں بھی سقم تھا کیونکہ اس کا اطلاق ہر مقام پر نہیں ہوتا ۔ فردیننڈ دساسر کہتا ہے کہ ''ہر صوتی تبادل ایک مخصوص وقت اور مقام سے تعلق رکھتا ہے ۔ کوئی تبادل ہر وقت اور ہر مقام پر واقع نہیں ہوتا۔''[1] وہ آگے چل کر پھر لکھتا ہے کہ ہمہ گیر تبادل شاذ ہی ہوتے ہیں ۔ بعض صوتی تبادل بعض حالات سے مخصوص ہوتا ہے جیسے لاطینی میں S (ایس یعنی س) صرف سروں (اصوات علت) کے درمیان یا بعض مخصوص مقامات پر r (ر) سے بدل جاتا ہے ۔ ایسے تبادل کو وہ مشروط کہتا ہے ۔[2]

میرے نزدیک گرم نے مفرد تبادل کا قانون پیش کیا تھا جس کا اطلاق ہر جگہ نہیں ہو جاتا اسی لیے پھر کارل ورنر اور گراس مین وغیرہ کو اس قانون میں کچھ ترمیم یا اصلاح کرنا پڑی جسے میں مرکب تبادل کہتا ہوں اور جس پر کبھی آئندہ تفصیل سے روشنی ڈالوں گا ۔

۱۔ کورس ان جنرل لنگوئسٹکس ، ص ۹۵ ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۱۴۴ ۔